تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب

”مروجہ تکافل (اسلامی بیمہ وانشورنس)

اور شرعی وقف“

ناشر تعمیر معاشرہ جامعہ خُلفائے رَاشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم

مدنی کالونی، ہاکس بے روڈ گریکس، ماڑی پور کراچی 0333-2117851

فتویٰ کا خلاصہ

(۱) تکافل میں نقود (یعنی کرنسی) کا وقف ہوتا ہے، جو کہ عندالاحناف رحمہم اللہ تعالیٰ راجح، مشہور اور مفتی بہ قول کے مطابق عرف اور تعامل نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک چونکہ نقود (یعنی کرنسی) کا عین حقیقۃً باقی نہیں رہتا، اس لئے جائز نہیں۔

(۲) تکافل کی پالیسیاں صرف اغنیاء ہی لے سکتے ہیں، مسکین اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

(۳) تکافل میں پالیسی لینے والے (پالیسی ہولڈرز) اور ممبر شپ حاصل کرنے والے موقوف علیہم ہوتے ہیں۔

(۴) تکافل میں وقف اغنیاء پر ہوتا ہے اور یہ وقف کسی مذہب میں جائز نہیں۔

(۵) اغنیاء اور فقراء اگر دونوں کو موقوف علیہم تسلیم بھی کیا جائے تو بھی تکافل کا وقف جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں وقف کی صحت کے لیے شرط یہ ہے کہ اغنیاء محصون ومحدود ہوں جبکہ تکافل میں اغنیاء غیر محدود ہوتے ہیں۔

(۶) جب تکافل کا وقف درست نہ ہوا تو شخصِ قانونی نہ رہا اور چندہ، چندہ دینے والوں کے ملک سے نہ نکلا، لہٰذا تکافل کے منتظمین پر لازم ہے کہ دینے والوں کو واپس کریں۔ خود استعمال کرنا حرام ہے۔

(۷) تکافل میں ''وقف'' اور ''چندہ'' کے الفاظ، صرف الفاظ کی حد تک ہیں، حقیقۃً اور مقصوداً نہ وقف ہے، اور نہ چندہ چندہ ہے، بلکہ عقدِ معاوضہ ہے، جو سود، قمار اور غرر کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔

(۸) تکافل کو مدارس پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مدارس میں چندہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اجر وثواب کی نیت سے دیا جاتا ہے کوئی ایک بھی سچا مسلمان اس نیت سے نہیں دیتا کہ آج قلیل رقم دے رہا ہوں اور کل مدرسہ سے اس کے بدلے یا نتیجے میں کثیر رقم واپس لوں گا، جبکہ تکافل کے وقف کو اس نیت سے تقریباً ہر ایک چندہ کے نام سے دیتا ہے کہ آج قلیل رقم دیتا ہوں، کل کثیر رقم لوں گا۔

(۹) آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کا مال اس کی طیبِ خاطر کے بغیر استعمال کرنا جائز نہیں، جبکہ تکافل میں چندہ واپس لینے کی نیت سے دیا جارہا ہے تو معلوم ہوا کہ مفت میں اللہ تعالیٰ کے نام پر کھلانے کی نیت ہے ہی نہیں! تو یہ چندہ تکافل والوں کے لیے کیسے حلال ہوگیا؟؟؟

(۱۰) نیوتہ یعنی شادی کے موقع پر ہدیہ اور تحفہ کے نام سے دی جانے والی رقوم اور اشیاء کو حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے عرف اور نیت کی وجہ سے ناجائز اور قرض قرار دیا ہے۔ جن کا مفت میں کھانا حرام اور لوٹانا واجب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکافل (اسلامی بیمہ وانشورنس) کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

المستفتی : رضوان احمد کراچی

الجواب باسم ملهم الصواب

چونکہ بقول حضرات مجوزین تکافل کی بنیاد وقف ہے اور درج ذیل وجوہ سے یہ وقف کسی مذہب میں بھی صحیح اور درست نہیں، اس لیے نہ یہ تکافل درست اور جائز ہے اور نہ ہی چندہ، چندہ دہندگان کی ملکیت سے خارج ہوا ہے، لہٰذا منتظمین تکافل کا چندہ کی رقوم کو خود ذاتی استعمال میں لانا اور دوسرے متضررین (پالیسی ہولڈرز) پر خرچ کرنا دونوں حرام ہیں اور آج تک جتنے لوگوں سے چندہ کے نام پر جتنی رقوم لی گئی ہیں اُن سب کو لوٹانا ان کے ذمہ واجب ہے۔

وجہ نمبر ۱ : تکافل میں نقود کو وقف کیا جاتا ہے اور نقود منقولات میں سے ہیں اور منقولات کے وقف کے لیے عُرف و تعامل شرط ہے جبکہ اس زمانے میں اس کا تعامل نہیں، لہٰذا یہ وقف درست نہیں :

منقولات کے وقف کی تین قسمیں ہیں:

(۱) منقول، غیر منقول کے تابع ہو کر وقف کیا جائے۔ جیسے کہ زمین کے ساتھ درختوں، بیلوں اور بنا وغیرہ کو وقف کرنا۔

(۲) وہ منقول جس کا وقف نص سے ثابت ہو۔ جیسے اسلحہ، زرہ، گھوڑے وغیرہ

(۳) ایسا منقول جو نہ غیر منقول کے تابع ہو اور نہ منصوص ہو، البتہ اس کے وقف کا عرف اور تعامل ہو۔

چونکہ نقود تیسری قسم کے منقولات میں داخل ہیں اس لیے اس کی صحت کے لیے بھی مفتی بہ، راجح اور جمہور کے قول کے مطابق تعامل شرط ہے۔ لہٰذا جہاں تعامل اور عرف نہیں وہاں وقف درست نہیں ہوگا اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کے مطابق بعض کے عمل (وقف کرنے) کو تعامل نہیں کہا جا سکتا۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالیٰ: (و) كما صح أيضا وقف كل (منقول) قصدا (فيه تعامل) للناس (كفأس و قدوم) بل (و دراهم و دنانير) قلت: بل ورد الأمر للقضاة بالحكم به كما في معروضات المفتي أبي السعود، و مكيل و موزون فيباع و يدفع ثمنه مضاربة أو بضاعة فعلى هذا لو وقف كرا على شرط أن يقرضه لمن لا بذر له ليزرعه لنفسه فإذا أدرک أخذ مقداره ثم أقرضه لغيره و هكذا جاز خلاصة۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ : مطلب في وقف المنقول قصدا (قوله : كل منقول قصدا) أما تبعا للعقار فهو جائز بلا خلاف عندهما كما مر لا خلاف في صحة وقف

السلاح و الكُراع أي الخيل للآثار المشهورة، و الخلاف فيما سوى ذلك فعند أبي يوسف لا يجوز، و عند محمد يجوز ما فيه تعامل من المنقولات و اختاره أكثر فقهاء الأمصار كما في الهداية، و هو الصحيح كما في الإسعاف، و هو قول أكثر المشايخ كما في الظهيرية؛ لأن القياس قد يترك بالتعامل، و نقل في المجتبى عن السِيَر جواز وقف المنقول مطلقا عند محمد، و إذا جرى فيه التعامل عند أبي يوسف، و تمامه في البحر، و المشهور الأول (قوله: و قدوم) بفتح أوله و ضم ثانيه مخففا و مثقلا.

مطلب في وقف الدراهم والدنانير: (قوله : بل ودراهم ودنانير) عزاه في الخلاصة إلى الأنصاري، وكان من أصحاب زفر، و عزاه في الخانية إلى زفر حيث قال: و عن زفر شرنبلالية، و قال المصنف في المنح: و لما جرى التعامل في زماننا في البلاد الرومية و غيرها في وقف الدراهم و الدنانير دخلت تحت قول محمد المفتى به في وقف كل منقول فيه تعامل كما لا يخفى؛ فلا يحتاج على هذا إلى تخصيص القول بجواز وقفها بمذهب الإمام زفر من رواية الأنصاري، والله تعالى أعلم، و قد أفتى مولانا صاحب البحر بجواز وقفها و لم يحك خلافا اهـ، ما في المنح قال الرملي: لكن في إلحاقها بمنقول فيه تعامل نظر إذ هي مما ينتفع بها مع بقاء عينها على ملك الواقف و إفتاء صاحب البحر بجواز وقفها بلا حكاية خلاف لا يدل على أنه داخل تحت قول محمد المفتي به في وقف منقول فيه تعامل؛ لاحتمال أنه اختار قول زفر و أفتى به و ما استدل به في المنح من مسألة البقرة الآتية ممنوع بما قلنا، إذ ينتفع بلبنها و سمنها مع بقاء عينها لكن إذا حكم به حاكم ارتفع الخلاف اهـ ملخصا. قلت: و إن الدراهم لا تتعين بالتعيين فهي و إن كانت لا ينتفع بها مع بقاء عينها لكن بدلها قائم مقامها لعدم تعينها فكأنها باقية و لا شك في كونها من المنقول فحيث جرى فيها تعامل دخلت فيما أجازه محمد، و لهذا لما مثل محمد بأشياء جرى فيها التعامل في زمانه، قال في الفتح: إن بعض المشايخ زادوا أشياء من المنقول على ما ذكره محمد لما رأوا جريان التعامل فيها، و ذكر منها مسألة البقرة الآتية و مسألة الدراهم و المكيل حيث قال: ففي الخلاصة: وقف بقرة على أن ما يخرج من لبنها و سمنها يعطى لأبناء السبيل، قال: إن كان ذلك في موضع غلب ذلك في أوقافهم رجوت أن يكون جائزا، و عن الأنصاري و كان من أصحاب زفر فيمن وقف الدراهم أو ما يكال أو ما يوزن أيجوز ذلك؟ قال: نعم، قيل: و كيف؟ قال: يدفع الدراهم مضاربة ثم يتصدق بها في الوجه الذي وقف عليه وما يكال أو يوزن يباع ويدفع ثمنه لمضاربة أو بضاعة، قال: فعلى هذا القياس إذا وقف كرا من الحنطة على شرط أن يقرض للفقراء الذين لا بذر لهم ليزرعون لأنفسهم ثم يؤخذ منهم بعد الإدراك قدر القرض ثم يقرض لغيرهم بهذا الفقراء أبدا على هذا السبيل يجب أن يكون جائزا، قال: و مثل هذا كثير في الديار الروميه اهـ.

مطلب في التعامل والعرف: (قوله: لأن التعامل يترك به القياس) فإن القياس عدم صحة وقف المنقول لأن من شرط الوقف التأبيد و المنقول لا يدوم و التعامل كما في البحر عن التحرير هو الأكثر استعمالا، و في شرح البيرى عن المبسوط: أن الثابت بالعرف كالثابت

بالنص اھ و تمام تحقیق ذلک فی رسالتنا المسماۃ "نشر العرف فی بناء بعض الأحکام علی العرف" و ظاھر ما مر فی مسألۃ البقرۃ اعتبار العرف الحادث فلا یلزم کونہ من عھد الصحابۃ، و کذا ھو ظاھر ما قدمناہ آنفا من زیادۃ بعض المشایخ أشیاء جری التعامل فیھا، و علی ھذا فالظاھر اعتبار العرف فی الموضع أو الزمان الذی اشتھر فیہ دون غیرہ فوقف الدراھم متعارف فی بلاد الروم دون بلادنا وقف الفأس و القدوم کان متعارفا فی زمن المتقدمین و لم نسمع بہ فی زماننا فالظاھر أنہ لا یصح الآن، ولئن وجد نادرا لا یعتبر، لما علمت من أن التعامل ھو الأکثر استعمالا فتأمل. (الشامیۃ ۳۶۴/۴، ط: ایچ ایم سعید)

و قال الامام برھان الدین ابن مازہ رحمہ اللہ تعالی : یجب أن یعلم أن الوقف المنقول تبعاً للعقار جائز، بأن جعل أرضہ وقفاً مع العبید و الثیران الذین یعملون فیھا و یصیر المنقول وقفاً تبعاً للعقار، و أما وقفہ مقصوداً إن کان کُراعاً أو سلاحاً یجوز و نعنی بالسلاح السلاحَ و نعنی بالکُراع جنس الخیل و الابل، و إن کان سوی ذلک، إن کان شیئاً لم یجز التعارف بوقفہ کالثیاب و الحیوان لا یجوز عندنا و إن کان متعارفاً کالفأس و القدوم و ثیاب الجنازۃ و ما یحتاج إلیہ من الأوانی و القدور فی غسل الموتی أو المصحف لقراءۃ القرآن، قال أبو یوسف رحمہ اللہ تعالی: لا یجوز وقال محمد رحمہ اللہ تعالی: یجوز و إلیہ ذھب عامۃ المشایخ منھم شمس الأئمۃ السرخسی رحمہ اللہ. و ذکر فی "شرح کتاب الوقف" فقال: ما تعارفہ الناس و لیس فی عینہ نص یبطلہ فھو جائز کما فی الاستصناع و غیر ذلک.

(المحیط البرھانی ۵۰۲/۸،ط:ادارۃ القرآن)

خود تکافل کے مجوز حضرت مولانا ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی، استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی لکھتے ہیں:

منقولی اشیاء کے وقف کی تیسری صورت یہ ہے کہ ان کے وقف کا تعامل ہو کہ اس جگہ اور اس زمانے میں لوگ ان منقولی اشیاء کا وقف کرتے ہوں تو عرف کی وجہ سے یہ وقف درست ہو جائے گا..........(آگے لکھتے ہیں)..........علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے صراحت کی ہے کہ اس مسئلہ میں فتویٰ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول پر ہے لہٰذا مفتی بہ قول کے مطابق جب منقولی اشیاء کے وقف کے جواز کا مدار عرف پر ہے تو اس میں ہر زمانے اور جگہ کے عرف کا الگ اعتبار ہوگا جہاں جس منقول چیز کے وقف کا عرف ہو وہاں اس کے وقف کی اجازت ہوگی، دوسری جگہ اگر اس کا عرف نہ ہو تو اس جگہ اس منقولی چیز کے وقف کی اجازت نہیں ہوگی، مثال کے طور پر امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے کلہاڑی، تیشہ اور درانتی وغیرہ کے وقف کی اجازت دی لیکن ہمارے ہاں اس کے وقف کا عرف نہیں تو ہمارے ہاں اس کے وقف کی اجازت نہیں ہوگی۔

مصحف (قرآنِ مجید) کے وقف کا عرف ان کے ہاں بھی تھا، ہمارے ہاں بھی ہے اس لیے آج کل بھی مصحف کے وقف کی اجازت ہوگی، ہسپتال میں استعمال ہونے والی منقولہ اشیاء جیسے اسٹریچر، ایمبولینس، چارپائی، مختلف مشینیں، ان کے وقف کا عرف ان کے زمانے میں نہیں تھا لیکن

آج کل اس کا عرف ہے اس لیے آج اگر انھیں کوئی وقف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

آج کل لوگ مسجد میں مریض نمازیوں کے لیے کرسیاں یا وہیل چیئر وقف کر دیتے ہیں اس کا بھی اب عرف ہو گیا، اس لیے یہ بھی جائز ہوگا۔............خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک جو منقولہ اشیاء غیر منقول کے تابع کر کے وقف کیے جائیں یا ان کے وقف کے بارے میں کوئی نص آئی ہو یا ان کے وقف کا عرف ہو تو ان صورتوں میں انھیں وقف کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

(اسلام کا نظامِ اوقاف ۲۳۲ تا ۲۳۴)

شوافع اور حنابلہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب :

حنابلہ اور شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر اس منقول چیز کا وقف جائز ہے جس کے عین کو باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع لیا جا سکتا ہو، جیسے گائے، درخت، زیورات، البتہ جن منقولات سے بدوں بقائے عین انتفاع ممکن نہ ہو بلکہ انتفاع کے لیے عین کا بدلنا اور ختم ہونا ناگزیر ہو تو ان کا وقف جائز نہ ہوگا جیسے گندم، آٹا، پھل، شہد اور نقد روپے پیسے وغیرہ۔

تنبیہ : احناف کثر اللہ سوادہم کے نزدیک ان ماکولات، مشروبات (آٹا، پھل، شہد وغیرہ) اور نقود کے وقف کا اگر عرف ہو جائے تو ان کا وقف بھی جائز ہے اور ان سے انتفاع کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان اشیاء کو بیچ کر اس کی قیمت تجارت میں لگائی جائے اور حاصل شدہ نفع سے ماکولات ومشروبات خرید کر موقوف علیہم پر خرچ کیا جائے، اس صورت میں شے موقوف کا عین اگرچہ حقیقۃً باقی نہیں رہا لیکن حکماً اب بھی باقی ہے، البتہ حنابلہ اور شوافع رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک چونکہ حقیقۃً عین کا باقی رہنا ضروری ہے اس لیے ان کے نزدیک ان اشیاء کا وقف درست نہیں۔

حنبلی فقیہ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں :

و جملة ذلک ان الذی یجوز وقفه، ما جاز بیعه، و جاز الانتفاع به مع بقاء عینه، و کان اصلا یبقی بقاء متصلا، کالعقار و الحیوانات و الاثاث و اشباه ذلک .... و هذا قول الشافعی.(المغنی لابن قدامة: ۸/۲۳۱، ط: هجر)

الحاصل : مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ نقود کا وقف دیگر ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدمِ بقاءِ عین کی وجہ سے ناجائز ہے اور احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدمِ عرف کی وجہ سے ناجائز ہے۔

رہی یہ بات کہ اس وقت نقود کے وقف کا عرف ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وقفِ نقود کے عرف کا نہ ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ ہمارے ملکِ پاکستان بلکہ اکثر ممالک میں اس وقت نقود کے وقف کا تعامل تو درکنار عمومی طور پر لوگ نقود کے وقف کو جانتے ہی نہیں۔ چنانچہ مدارس، شفاء خانوں اور رفاہی اداروں میں ہمیشہ سے لوگ رقوم جمع کرتے ہیں لیکن کسی کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ کہہ دے کہ یہ وقف ہے اس کے عین کو محفوظ رکھ کر پہلے اس سے تجارت کی جائے اور جب سال دو سال میں نفع آ جائے تو ان منافع کو صرف کیا جائے۔

وجہ نمبر ۱ کا حاصل : چونکہ تکافل کی بنیاد وقفِ نقود پر ہے لہٰذا تعامل اور عرف نہ ہونے کی وجہ سے

عندنا اور عدم بقاءِ عین کی وجہ سے عند غیرنا من الائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ یہ وقف ہی درست نہیں۔ جب وقف درست نہ ہوا تو شخصِ قانونی بھی نہ رہا، اور جب شخص قانونی نہ رہا تو چندہ بھی دہندگان (دینے والوں) کی مِلک میں بدستور باقی رہے گا، اگر وہ زندہ ہیں تو انہی کو لوٹایا جانا واجب ہے، ورنہ ان کے ورثہ کو۔ نیز دہندگان پر زکوۃ بھی واجب ہوگی۔

وجه نمبر ۲ : فقط اغنیاء پر وقف جائز نهیں :

وقف کے جواز اور صحت کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وقف صرف اغنیاء پر نہ ہو، (یعنی موقوف علیہم صرف اغنیاء نہ ہوں) ورنہ وقف جائز نہ ہوگا جبکہ تکافل کی پالیسی کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقف صرف اغنیاء ہی پر ہے کیونکہ اس کی مختلف پالیسیاں صرف اغنیاء ہی لے سکتے ہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى : لو وقف على الاغنياء وحدهم لم يجز لانه ليس بقربة . (الشامية ،كتاب الوقف ۳۳۸/۴،ط :سعيد)

شوافع اور مالکیه رحمهم الله تعالیٰ کا مذهب :

مجوزِ تکافل ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی صاحب نے خود علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کی جو عبارت اور اس کا ترجمہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات شوافع اور مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی اس صورت میں احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے مطابق ہے۔

امام نووی رحمه الله تعالیٰ کی عبارت اور ڈاکٹر صاحب کا ترجمه :

و إن لم يظهر قصد القربة كالوقف على الاغنياء فوجهان بناء على أن المرعى بالوقف على الموصوفين جهة القربة أم التمليك فحكى الامام عن المعظم: أنه القربة ...... و عن القفال أنه قال: التمليك كالوصية و كالوقف على المعين ...... فإن قلنا بالاول لم يصح الوقف على الاغنياء و اليهود و النصارى و الفساق و الاصح الجميع ...... و الاشبه بكلام الاكثرين ترجيح كونه تمليكا و تصحيح الوقف على هؤلاء ...... لكن الأحسن توسط لبعض المتأخرين و هو تصحيح الوقف على الاغنياء و إبطاله على اليهود و النصارى و قطاع الطريق و سائر الفساق لتضمنه الاعانة على المعصية. (روضة الطالبين و عمدة المفتين ۳۲۰/۵،ط:مكتبه اسلامى بيروت)

ترجمہ : اگر وقف میں قربت کا قصد ظاہر نہ ہو جیسے اغنیاء پر وقف تو اس میں دو رائے اس بنیاد پر ہوسکتی ہیں کہ معین لوگوں پر وقف کرنے کی صورت میں قربت کے پہلو کی رعایت رکھی جائے گی یا تملیک کی؟ امام سے ایک روایت یہ ہے کہ قربت کے پہلو کی رعایت رکھی جائے گی قفال سے مروی ہے تملیک کی رعایت رکھی جائے گی جیسے معین لوگوں کے لئے وصیت کرنے کی صورت میں تملیک کا لحاظ رکھا جاتا ہے اگر ہم پہلے قول کو لیں تو اغنیاء یہود و نصاری اور فساق پر وقف جائز نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہاں قربت نہیں پائی جارہی، اکثر شوافع نے تملیک کا لحاظ رکھنے کو ترجیح دی ہے اور ان سب پر وقف کو جائز قرار دیا ہے لیکن سب سے بہترین بات وہ ہے جو بعض متأخرین کا قول متوسط

ہے کہ اغنیاء پر وقف تو جائز ہو اور یہود ونصاری ڈاکوؤں اور دیگر فاسق لوگوں پر وقف درست نہ ہو کیونکہ اس میں گناہ میں تعاون لازم آتا ہے۔ (اسلام کا نظام اوقاف: ٣٤٥، ٣٤٦)

اس عبارت میں خط کشیدہ لفظ ''معین لوگوں'' سے واضح ہو گیا کہ جواز وعدمِ جواز کا اختلاف ان ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس صورت میں ہے جبکہ اغنیاء محصون اور محدود ہوں۔ اگر اغنیاء محصون اور محدود نہ ہوں گے تو پھر وقف اتفاقاً جائز نہ ہوگا۔

دیکھئے! احناف رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محصون اور محدود ہونے کی صورت میں اتفاقاً یہ وقف تملیکاً بمعنی وصیت جائز ہے، پھر بھی محصون اور محدود نہ ہونے کی صورت میں اتفاقاً ناجائز ہے، تو ان حضرات کے نزدیک تو یہ صورت بطریقِ اولیٰ ناجائز ہوگی، کیونکہ ان کے ہاں محصون اور محدود ہونے کی صورت میں بھی اتفاق نہیں بلکہ اختلاف ہے۔

تکافل میں ظاہر ہے کہ اغنیاء محصون اور محدود نہیں ہوتے، کیونکہ تکافل کا اعلان ہے کہ دنیا بھر کے اغنیاء ہماری تکافل کی پالیسیاں لے کر ہمارے وقف کا موقوف علیہم بن سکتے ہیں۔

وجہ نمبر ٢ کا حاصل : اس وجہ کے پیشِ نظر جب کسی بھی مذہب میں یہ وقف ہی درست نہ ہوا تو شخص قانونی بھی نہ رہا اور جب شخص قانونی نہ رہا تو چندہ، چندہ دہندگان کی ملکیت میں بدستور باقی رہا، اگر وہ زندہ ہیں تو ان کو لوٹایا جائے ورنہ ان کے ورثاء کو، نیز ان رقوم کی زکوٰۃ بھی ان پر واجب ہوگی اور منتظمین تکافل کے لیے اس چندے سے کچھ لینا حرام ہوگا۔

وجہ نمبر ٣ : اغنیاء اور فقراء دونوں پر وقف کے جواز کی شرط کا نہ ہونا:

اگر کوئی کہے کہ تکافل میں اغنیاء اور فقراء دونوں پر وقف ہوتا ہے اور یہ جائز ہے تو یاد رہے کہ اس کا جواز اس شرط سے ہے کہ اغنیاء محصون اور محدود ہوں، جبکہ تکافل میں اغنیاء محصون اور محدود نہیں ہوتے، کما لا یخفی۔

لا يجوز الوقف على الاغنياء وحدهم و لو وقف على الاغنياء و هم يحصون ثم بعدهم على الفقراء يجوز و يكون الحق للاغنياء ثم للفقراء كذا في محيط السرخسي.

(الهندية ٢/٣٦٩، ط: رشيدية)

وجہ نمبر ٣ کا حاصل : اس وجہ کا حاصل بھی یہی ہے کہ وقف ابتداء ہی سے صحیح اور درست نہیں لہٰذا جب وقف ہی صحیح نہیں ہوا تو شخص قانونی بھی نہ رہا، اور جب شخص قانونی نہ رہا تو چندہ، چندہ دہندگان کی ملکیت میں بدستور باقی رہا، اگر وہ زندہ ہیں تو ان کو لوٹایا جائے ورنہ ان کے ورثاء کو، نیز ان رقوم کی زکوٰۃ بھی ان پر ہوگی۔

وجہ نمبر ٤ : قاعدہ ''العبرة في العقود للمعاني'' اور قاعدہ ''الامور بمقاصدها'' کی مخالفت :

العبرة في العقود للمعاني و الامور بمقاصدها کے پیشِ نظر تکافل میں ''وقف'' اور اس کو جو ''چندہ'' دیا

جا تا ہے وہ صرف الفاظ کی حد تک ہے، باقی معنیً وحقیقۃً ومقصوداً یہ عقدِ معاوضہ (یا قرض) ہے، لہٰذا بیمہ اور انشورنس کی طرح یہ بھی سود، قمار اور غرر کی وجہ سے نا جائز اور حرام ہے، اور نیوتہ کی طرح قرض ہے، جس کا اصلی مالکوں کو لوٹانا فرض ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ تکافل کے جواز کی بنیاد ''وقف فنڈ'' ہے جیسے مدارسِ اسلامیہ اور دوسرے رفاہی کام کرنے والے اوقاف کو عام لوگ چندہ دیتے ہیں، اسی طرح پالیسی ہولڈرز ''وقف فنڈ'' کو چندہ دیتے ہیں، جب مدارس کا یہ چندہ جائز ہے تو تکافل میں ''وقف فنڈ'' کو چندہ دینا بھی جائز ہوگا۔ اور ان کے ساتھ وقف فنڈ کا تعاون بھی جائز ہوگا، اور چندہ دینے والوں کا وقف فنڈ سے انتفاع بھی جائز ہوگا، جیسے مدارس وغیرہ سے چندہ دینے والوں کا انتفاع جائز ہے۔

قیاس مع الفارق : تکافل کو مدارس وغیرہ رفاہی اداروں پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، کیونکہ مدارس اور تکافل کے چندہ میں زمین وآسمان کا جو فرق ہے وہ کسی ذی فہم پر مخفی نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان مدارس وغیرہ وقف اداروں کو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی نیت سے چندہ دیتے ہیں نہ کہ مالی منفعت کے لیے، کہ کل یہ مدارس وغیرہ اس چندہ کی رقم کے عوض اور بدلہ میں مجھے بہت ساری رقم دیں گے، جبکہ تکافل کمپنی میں ''وقف فنڈ'' کو چندہ دینے والے مالی منفعت کی نیت سے دیتے ہیں کہ مستقبل میں یہ چندہ بہت بڑی رقم کھینچ کر مجھے دلائے گا۔

چنانچہ مفتی عصمت اللہ صاحب لکھتے ہیں :

> ''جب کوئی شخص پریمیم جمع کراتا ہے تو اس نیت سے کراتا ہے کہ بوقتِ نقصان زیادہ ملے گا اور اس زیادت کے لیے وہ کمپنی کو مجبور بھی کرسکتا ہے''۔ (تکافل کی شرعی حیثیت، ص: ۱۴۰)

یہی وجہ ہے کہ مدارس کے ذمہ داران چندہ دینے کی ترغیب میں یہ نہیں کہتے کہ آج چندہ دو اور کل کئی گنا رقم کی صورت میں واپس لو بلکہ یہ ترغیب دیتے ہیں کہ آج دو اور کل قیامت میں اللہ تعالیٰ سے خوشنودی اور جنت کی صورت میں لو، جبکہ تکافل کا پیغام پہنچانے والے یہ ترغیب دیتے ہیں کہ آج قلیل رقم دو............کل کثیر رقم لو۔

لہٰذا تکافل کو مدارس پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق اور مردود ہے۔

اس نیت کے واضح فرق کے بعد یاد رکھیے کہ ''نام'' سے حقیقت نہیں بدلتی، پولیس کا رشوت کو چائے پانی کہنے سے اور کسی افسر سے دنیاوی کام نکالنے کی لالچ میں رشوت کو ہدیہ اور تحفہ کہنے سے، اور شادی بیاہ کے موقع پر قرض (بنام نیوتہ) کو باہمی تعاون وامداد کا نام دینے سے یہ امور نہ جائز ہوں گے اور نہ ہی یہ رقم رشوت اور قرض سے نکلے گی بلکہ ان ناموں کے باوجود بھی یہ بحکمِ رشوت اور قرض ہوں گی، جیسے گدھے کو اگر کوئی بکرا کہے تو وہ حلال نہ ہوگا بلکہ نام کی تبدیلی کے باوجود گدھا، گدھا اور حرام ہی رہے گا، جب تک نمک کی کان میں اپنی حقیقت سے دستبردار ہو کر نمک نہ بن جائے۔

اس تفصیل کی دلیل صحیح بخاری وصحیح مسلم کی حدیث جو مشکوٰۃ صفحہ ۱۵۶ (طبع قدیمی کتب خانہ) پر ہے اور اس سے

مستنبط وہ ضابطہ ہے جس کو علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے صاحبِ مشکوٰۃ نے تحریر فرمایا ہے :

عن أبی حمید الساعدی قال: استعمل النبی ﷺ رجلا من الأزد، یقال له: ابن اللتبیة، علی الصدقة، فلما قدم قال: هذا لکم و هذا أهدی لی، فخطب النبی ﷺ فحمد الله و أثنی علیه، ثم قال: أما بعد، فإنی أستعمل رجالا منکم علی أمور مما ولانی الله، فیأتی أحدکم فیقول: هذا لکم و هذا هدیة أهدیت لی، فهلا جلس فی بیت أبیه أو بیت أمه فینظر أیهدی له أم لا؟ و الذی نفسی بیده، لا یأخذ أحد منه شیئا إلا جاء به یوم القیامة یحمله علی رقبته، إن کان بعیرا له رغاء، أو بقرا له خوار، أوشاة یتعر، ثم رفع یدیه حتی رأینا عفرة إبطیه، ثم قال: اللهم هل بلغت اللهم هل بلغت، متفق علیه (مشکوٰة ۱۵۶، ط: قدیمی)

قال الخطابی رحمه الله تعالی: و فی قوله: هلا جلس فی بیت أمه أو أبیه فینظر أیهدی إلیه أم لا؟ دلیل علی أن کل أمر یتذرع به إلی محظور فهو محظور، و کل دخیل فی العقود ینظر هل یکون حکمه عند الانفراد کحکمه عند الاقتران أم لا،(المشکوة)

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو عامل بنا کر بھیجا انہوں نے واپس آ کر آپ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ کا مال پیش کر کے عرض کیا "**هذا لکم**" یہ تمہارے لیے ہے، اور اس کے علاوہ کچھ اور مال تھا، اس کے متعلق عرض کیا کہ یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا، اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ "میں بعض لوگوں کو عامل بنا کر بھیجتا ہوں وہ واپس آ کر کہتے ہیں کہ یہ مال تو زکوٰۃ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، اس کے بعد فرمایا "**فهلا جلس فی بیت أبیه أو بیت أمه فینظر أ یهدی له أم لا ؟** " یہ شخص اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ رہا پھر دیکھتا کہ اس کو ہدیہ ملتا ہے یا نہیں؟

فائدہ: اس حدیث میں آپ ﷺ نے ہدیہ کے نام کی وجہ سے اس مال کو ہدیہ اور تحفہ قرار نہیں دیا، بلکہ اس خاص منصب کی وجہ سے ملنے والی رقم کو ناجائز اور رشوت میں داخل فرما کر اس پر تنبیہ فرمائی۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث سے یہ ضابطہ مستنبط فرمایا ہے کہ اگر ایک عقد دوسرے سے ملا کر ایک وقت میں دو عقد اور دو معاملے کیے جا رہے ہوں تو اس کے جواز اور عدمِ جواز معلوم کرنے کا ایک ضابطہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اگر یہ دونوں عقد علیحدہ علیحدہ ہوں تو اس صورت میں بھی اس کی وہی حیثیت باقی رہتی ہے جو حالتِ اقتران میں تھی یا بدل جاتی ہے؟ اگر وہی رہتی ہے تو جائز ورنہ ناجائز۔

مثلاً ایک شخص دوسرے سے قرض لیتا ہے اور مقرِض اس قرض پر سود وصول کرنا چاہتا ہے لیکن حیلہ بہانہ کے ساتھ، اس لیے وہ کہتا ہے کہ ٹھیک ہے میں آپ کو قرض دیتا ہوں لیکن آپ مجھ سے یہ سو روپے کی چیز پانچ سو میں خرید لو، اب یہ عقد اور معاملہ، قرض کے عقد اور معاملے کے ساتھ ایک وقت میں مقترن اور جمع ہو گیا، اب اس کے جواز اور عدمِ جواز کے لیے یہ دیکھا جائے گا کہ حالتِ انفراد میں بھی اس عقد کی یہی حالت ہے یا نہیں؟ اگر ہے، یعنی بدوں قرض بھی یہ شخص اس سو روپے کی چیز کو پانچ سو میں خریدتا ہے تو حالتِ اقتران میں خریدنا جائز، اگر نہیں خریدتا تو حالتِ

اقتران میں خریدنا ناجائز اور سود ہے۔

حدیث میں بھی جس ہدیہ کی وصولی پر انکار فرمایا گیا ہے اس کی یہی وجہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ یہ ہدیہ اس خاص منصب کی وجہ سے ہے اگر یہ منصب نہ ہوتا تو یہ ہدیہ بھی نہ ملتا، گویا یہاں عقدِ ہبہ اور عامل ہونا یہ دو معاملے مقترن اور جمع ہو گئے، حدیث کے مطابق اب دیکھا جائے گا کہ اس ہدیہ کی یہ حیثیت حالتِ انفراد میں بھی یہی رہتی ہے یا نہیں؟ یعنی اگر یہ منصب نہ ہوتا تو بھی یہ ہدیہ ملتا یا نہیں؟ اگر ملتا تو منصب کے ساتھ ملنا جائز ہے، اگر نہ ملتا تو منصب کے ساتھ ملنا ناجائز اور رشوت ہے۔

تکافل کمپنی میں بھی اسی طرح دو عقد اور معاملے ایک دوسرے کے ساتھ مقترن اور جمع ہیں، گو شرط نہیں، اب یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اس کے معلوم کرنے کا طریقہ آپ ﷺ کی حدیث اور علامہ خطابی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مستنبطہ ضابطہ کے پیشِ نظر یہ ہوگا کہ حالتِ انفراد میں اگر ان کی حیثیت وہی حالتِ اقتران کی برقرار رہتی ہے تو یہ دونوں معاملے جائز ہوں گے اور اگر حقیقت بدل جاتی ہے تو پھر جائز نہیں ہوں گے۔

اب ہر دانشمند مسلمان اس پر غور کرے اور خود فیصلہ کرے کہ حالتِ انفراد میں اس کی حیثیت بدلتی ہے یا نہیں؟......ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت بدل جاتی ہے کیونکہ اگر تکافل کمپنی اس ''وقف فنڈ'' کو چندہ دینے والے کے نقصان کی ضمانت کسی بھی صورت میں اور کسی بھی طریقے سے نہ دے تو شاید کوئی ایک بھی اس فنڈ کو چندہ نہ دے، اسی طرح ''تکافل کمپنی'' اور ''وقف فنڈ'' کسی ایسے آفت زدہ مسلمان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتے ہوئے اس کے نقصان کی تلافی کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں گے، جو ان کے قائم کردہ وقف کو چندہ نہ دیتا ہو۔

جب معلوم ہوا کہ حالتِ انفراد میں یہ تبرع اور احسان نہیں ہوتا تو حالتِ اقتران میں بھی اس کو تبرع اور احسان نہیں کہا جا سکے گا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ تبرع اور چندہ صرف نام کا تبرع اور چندہ ہے حقیقت میں یہ عقدِ معاوضہ ہے یعنی پالیسی ہولڈر اس رقم کے عوض تکافل پالیسی خریدتا ہے لہٰذا نام کی وجہ سے یہ عقدِ معاوضہ سے خارج نہ ہوگا، بلکہ اس میں داخل ہوگا۔ جیسے اس حدیث میں آپ ﷺ نے ہدیہ کے نام سے عامل کو ملی ہوئی چیزیں ہدیہ میں داخل نہیں فرمائیں بلکہ اس کی حقیقت جو رشوت ہے، کے پیشِ نظر، اس کو ناجائز فرما کر سخت تنبیہ فرمائی۔ (اور یہی قاعدہ ''العبرة للمعانی'' کا تقاضا بھی ہے)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تکافل کمپنی اور ''وقف فنڈ'' کے ساتھ پالیسی ہولڈرز کا معاملہ فی سبیل اللہ چندہ کا نہیں بلکہ دوسری انشورنس کمپنیوں کی طرح یہ بھی عقدِ معاوضہ ہے، جس کو تمام علماء بالاتفاق سود، قمار اور غرر کی وجہ سے ناجائز اور حرام فرماتے ہیں۔ (یا ''نیوتہ'' کی طرح قرض ہے جس کا مفت میں کھانا حرام ہے اور چندہ دہندگان کو واپس کرنا واجب ہے)

وجہ نمبر ٤ کا حاصل : اس وجہ کا حاصل یہ ہے کہ نہ یہ وقف، وقف ہے اور نہ ہی یہ چندہ، چندہ۔ بلکہ (یا تو قرض ہے جس کا لوٹانا واجب ہے اور مفت میں کھانا حرام ہے یا) عقدِ معاوضہ ہے جس کے نتیجے میں دو بڑی

خرابیاں لازم آئیں :

(۱) سود، قمار اور غرر کا ارتکاب اور گناہ

(۲) دینے والے کا چندہ کے ثواب سے محرومی اور لینے والے کے حرام کا ارتکاب

(۱) سود، قمار، اور غرر کے ارتکاب کی تفصیل :

عقدِ معاوضہ بننے کے بعد تکافل میں سود، قمار اور غرر کس طرح پایا جاتا ہے؟ اس کی وضاحت درج ذیل ہے :

سود کی وضاحت : اس کی وضاحت کچھ یوں ہے تکافل میں ثمن قسطیں ہیں، اور مبیع تکافل پالیسی ہوتی ہے، جس میں کمی بیشی ہوتی ہے، لہٰذا یہ بیع ہے اور باقاعدہ عقدِ معاوضہ ہے۔ یعنی پالیسی ہولڈر بطورِ مشتری اور خریدار...... وقف فنڈ (شخص قانونی) بطورِ بائع اور بیچنے والا...... اقساط بطورِ ثمن و قیمت...... تکافل پالیسی بطورِ مبیع کے ہے۔

اس سے تکافل کا عقد معاوضہ ہونا بالکل واضح ہے اور چونکہ دونوں بدل اور عوض نقد ہیں، جس کے تبادلہ میں کمی بیشی ''ربا الفضل'' ہے جو حرام ہے............ اور سود کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو کم رقم اس شرط پر دے کہ دوسرا فریق اس رقم کے بدلے اسے کچھ بڑھا کر دے گا۔

تکافل کے اندر کم پریمیم اور ثمن کے بدلہ زیادہ رقم کی پالیسی خریدی جاتی ہے، یہی سود ہے۔

قمار کی وضاحت : تکافل کے اندر پائی جانے والے دوسری بڑی خرابی ''قمار'' ہے، جسے اردو میں ''جوا'' کہتے ہیں، اور قمار کی حقیقت یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد فریق آپس میں اس طرح کا کوئی معاملہ کریں جس کے نتیجے میں ہر فریق کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر اپنا کوئی مال (فوری ادائیگی کر کے یا ادائیگی کا وعدہ کر کے) اس طرح داؤ پر لگائے کہ وہ یا تو بلا معاوضہ دوسرے فریق کے پاس چلا جائے یا دوسرے فریق کا مال پہلے فریق کے پاس بلا معاوضہ آجائے۔ اسی کو ''مخاطرۃ'' کہا جاتا ہے کہ جس میں یا تو اصل رقم بھی ڈوب جاتی ہے اور یا مزید رقم کھینچ کر لے آتی ہے اور یہی قمار ہے''۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: وسمي القمار قمارا ،لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوّز أن يذهب ماله الى صاحبه ويجوّز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (الشامية، فصل فى البيع ۶/۴۰۳،ط:سعيد)

غرر کی وضاحت : تکافل میں پائی جانے والی تیسری بڑی خرابی ''غرر'' کی ہے۔ سود اور قمار کی طرح ''غرر'' بھی شرعاً ناجائز ہے اور احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

عَن أَبِی هُرَیرَةَ قَالَ: نَهَی رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَن بَیعِ الحَصَاةِ وَ عَن بَیعِ الغَرَرِ.

(مسلم ، كتاب البيوع، ۲/۲، ط: قديمى)

لغوی اعتبار سے غرر ''غیر یقینی کیفیت'' کا نام ہے۔ اور اصطلاحِ شرع میں غرر ایسے معاملہ کو کہا جاتا ہے ''جس میں کم از کم کسی ایک فریق کا معاوضہ غیر یقینی کیفیت کا شکار ہو، جس کا تعلق معاملہ کے اصل اجزاء سے ہو''

تکافل کے اندر غرر کثیر کی خرابی موجود ہے، کیونکہ تکافل کے اندر جس خطرے کی حفاظت کے لیے معاملہ کیا جاتا ہے اس کا پایا جانا غیر یقینی ہے کہ معلوم نہیں کتنی رقم واپس ہوگی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی ہے ساری کی ساری ڈوب جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نقصان اور حادثہ کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے، یعنی صورت حال واضح نہیں، اور اسی کو ''غرر'' کہتے ہیں کہ ارکانِ عقد یعنی ثمن و قیمت، مبیع یعنی بیچی جانے والی چیز، یا اجل/ مدت میں سے کوئی چیز مجہول ہو، یا کسی مجہول اور غیر معین واقعے پر موقوف ہو۔

(۴) دینے والے کا چندہ کے ثواب سے محرومی اور لینے والے کے حرام کے ارتکاب کی تفصیل:

چندہ اور تصدق پر ثواب ملنے اور دوسرے کے لیے حلال ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ چندہ اور تصدق اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے طیبِ خاطر سے دیا جائے جیسے مدارسِ دینیہ اور دیگر رفاہی اداروں میں دیا جاتا ہے، اگر اس کے خلاف پر واضح قرائن موجود ہوں تو نہ ہی اس پر ثواب ملے گا اور نہ ہی دوسرے کے لیے مفت میں حلال ہوگا۔

نیت کی خرابی کی وجہ سے صدقہ کی ممانعت قرآن کریم، اقوال صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اقوال فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے ثابت ہے۔

(۱) ﴿ولا تمنن تستكثر﴾ [المدثر : ٦]

یعنی آپ ﷺ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ ﷺ کو حاصل ہوجائے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے **"لا تعط عطية تلتمس بها أفضل منها"** فرما کر اس طرح کے تبرع کو رد فرمایا ہے۔

(۲) ﴿وَمَا آتَيتُم مِن رِبًا لِيَربُوَ فِي أَموَالِ النَّاسِ فَلَا يَربُو عِندَ اللَّهِ وَمَا آتَيتُم مِن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجهَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ المُضعِفُونَ﴾ [الروم : ۳۹]

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> ....اور بعض علماءِ تفسیر نے ....اس کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ جو شخص کسی کو اپنا مال اخلاص اور نیک نیتی سے نہیں بلکہ اس نیت سے دے کہ میں اس کو یہ چیز دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلے میں اس سے زیادہ دے گا جیسے بہت سی برادریوں میں نیوتہ کی رسم ہے کہ وہ ہدیہ کے طور پر نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے دی جاتی ہے یہ دینا چونکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی غرض کے لیے ہے، اس لیے آیت میں فرمایا کہ اس طرح اگرچہ ظاہر میں مال بڑھ جائے مگر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہیں بڑھتا، ....اس تفسیر پر آیت مذکورہ کا وہ مضمون ہوجائے گا جو دوسری ایک آیت میں رسول کریم ﷺ کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا ہے: ﴿و لا تمنن تستكثر﴾ [۷۴:۶] یعنی آپ ﷺ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ اس کے بدلہ میں کچھ مال کی زیادتی آپ ﷺ کو حاصل ہوجائے گی۔

اور سورہ روم کی اس آیت میں بظاہر یہ دوسری تفسیر ہی راجح معلوم ہوتی ہے............(اس آیت سے پہلے) آیت نمبر ۳۸ میں رشتے داروں اور مساکین اور مسافروں پر خرچ کرنے کے ثواب ہونے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی ہو، تو اس کے بعد والی آیتِ مذکورہ میں اس کی توضیح اس طرح کی گئی کہ اگر مال کسی کو اس غرض سے دیا جائے کہ اس کا بدلہ اس کی طرف سے زیادہ ملے گا، تو یہ رضا جوئی حق تعالیٰ کے لیے خرچ نہ ہوا، اس لیے اس کا ثواب نہ ملے گا۔(معارف القرآن ۱/۶۶۱،۶۶۲)

اور حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے نیوتہ کے بارے میں بالاتفاق فرمایا ہے کہ نیوتہ میں اگر چہ انداز اور الفاظ ہدیہ اور تبرع کے ہیں لیکن قرائن اس کے خلاف ہیں، اسی وجہ سے اس کو قرض قرار دیا گیا ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: و في الفتاوى الخيرية: سئل فيما يرسله الشخص إلى غيره في الاعراس و نحوها، هل يكون حكمه حكم القرض فيلزمه الوفاء به أم لا؟ أجاب: إن كان العرف بأنهم يدفعونه على وجه البدل يلزم الوفاء به مثليا فبمثله، و إن قيميا فبقيمته، و إن كان العرف خلاف ذلك بأن كانوا يدفعونه على وجه الهبة، و لا ينظرون في ذلك إلى إعطاء البدل، فحكمه حكم الهبة في سائر أحكامه، فلا رجوع فيه بعد الهلاك أو الاستهلاك، و الأصل فيه أن المعروف عرفا كالمشروط شرطا اهـ، قلت: و العرف في بلادنا مشترك، نعم! في بعض القرى يعدونه قرضا حتى إنهم في كل وليمة يحضرون الخطيب يكتب لهم ما يهدى، فإذا جعل المهدى وليمة يراجع المهدى الدفتر فيهدى الأول إلى الثاني مثل ما أهدى إليه. (الشامية ، كتاب الهبة ۵/۶۹۶،ط:سعيد)

یہاں تکافل میں بھی قرائن بتا رہے ہیں کہ دینے والے صرف اس نیت سے دیتے ہیں کہ اس دینے کی وجہ سے کثیر رقم ملے گی لہٰذا یہ دینے والوں کی طرف سے قرض ہے جو ہر صورت میں تکافل والوں کی ذمہ واجب الرد ہے اور اس کا دبانا حرام اور زیادتی سود ہے۔

حدیث میں ہے : " **لا يحل مال امرء مسلم الا بطيب نفس منه**" یعنی کسی مسلمان کا مال اس کی طیب خاطر (دلی خوشی) کے بغیر کسی کے لیے حلال نہیں۔اور اس طرح ارشاد ہے "**كل قرض جر منفعة فهو ربا**" یعنی ہر وہ قرض جو نفع کھینچ لائے، وہ سود ہے۔

نیوتہ کی حرمت اور ناجائز ہونے کی وجہ تو صرف المعروف کالمشروط ہے، وہاں لینے والے کی طرف سے یہ اعلان نہیں ہوتا کہ جو مجھے دیگا تو میں بھی اس کی شادی میں دونگا، پھر بھی حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کو صراحۃً ناجائز فرمایا ہے، بلکہ ناجائز فرما کر اس کو قرض اور واجب الرد فرمایا ہے، جبکہ یہاں تکافل میں المعروف کالمشروط کے علاوہ خود تکافل کمپنی اور ان کے ایجنٹوں کی ترغیبات، وقف کی پالیسیاں اور اس کا اعلان، اس کے ممبر شپ حاصل کرنے پر قانوناً ملنے کے اختیارات پانا وغیرہ وغیرہ واضح قرائن ہیں کہ مقصد اور نیت صرف چندہ دینا نہیں، بلکہ زیادتی کی شرط کے ساتھ چندہ دینا ہے، لہٰذا یہ تو بطریق اولیٰ نیوتہ کی طرح ناجائز اور زیادہ لینا سود ہوگا۔

چندہ اور صدقہ کے نام سے دینے والا اگر بھولے سے چندے کا نام لیتا ہے تو بھی صرف نام کی حد تک لیتا ہے، مقصد اور نیت اس کے عوض میں زیادہ رقم وصول کرنا ہے اور اکثر ممبر چندے کا لفظ استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے تکافل پالیسی خریدی ہے لہٰذا نیت کے بگاڑ کی وجہ سے نہ چندہ دینے والے کو ثواب ملے گا اور نہ لینے والوں کے لیے مفت میں کھانا حلال ہوگا۔

اشکال : بعض کا کہنا ہے کہ آیت ﴿ولا تمنن تستکثر﴾ اور نیوتہ کے نام پر ہدیہ اور قرض کا تعلق وقف سے ہٹ کر دوسرے تبرعات سے ہے، وقف سے ان کا تعلق نہیں، کیونکہ وقف میں اس بات پر اتفاق ہے کہ واقف بھی خود اپنے وقف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لہٰذا اس آیت کے مدلول اور نیوتہ کے حکم سے تکافل کے چندہ پر اعتراض کرنا درست نہیں۔

جواب : یہاں دو باتیں ہیں :

(۱) واقف کا اپنے شیء موقوف سے نفع اٹھانا، جیسے کسی نے کنواں وقف کیا تو واقف دوسرے لوگوں کی طرح اس کنویں سے پانی کے استعمال کا نفع اٹھا سکتا ہے، یا کسی نے مدرسہ کے لیے زمین وقف کی تو جیسے دوسرے لوگ اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، خود واقف اور اس کی اولاد بھی اس مدرسہ میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، یہ اتفاقی بات ہے کہ واقف اپنے شیء موقوف سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے بلکہ بوقتِ وقف اگر نفع اٹھانے کی شرط بھی لگائے تو بھی جائز ہے۔ اور بلاشبہ اس صورت کے ساتھ آیت اور نیوتہ حکم کا تعلق نہیں۔

(۲) موقوف شیء کو چندہ دینے والا اس نیت اور شرط سے چندہ دے کہ یہ وقف حوض جو شخصِ قانونی اور مثلِ زید کے ایک فرد ہے، مستقبل میں واپس دے گا بلکہ مستقبل میں اس کو جو دوسروں نے چندہ دیا ہے ان میں سے بھی کچھ دے گا، یہ صورت نیوتہ کی طرح قرض ہے، اور اس آیت کی وعید میں داخل اور حدیث ''**کل قرض جر منفعة فهو ربا**'' اور قولِ صحابی'' **لا تعط عطية تلتمس بها أفضل منها** '' (یعنی عطیہ اس نیت سے نہ دو کہ تو اس کے ذریعے سے اس سے زیادہ طلب کر رہے ہو) کا مصداق ہے۔ اس صورت کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا۔ ورنہ حوالہ درکار ہے۔

مزید وضاحت یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص مدرسہ کے لیے زمین وقف کرے پھر اس کے بعد مدرسہ چلانے کے لیے چندہ دینے والا اس نیت سے چندہ دے کہ مستقبل میں یہ چندہ واپس ملے گا اور دوسروں کے دیئے ہوئے چندہ میں سے بھی کچھ حصہ ملے گا۔ تو بھلا اس کے ناجائز ہونے میں کیا شبہہ ہے؟...... اور کس نے کہا ہے کہ یہ صورت آیت کی وعید اور نیوتہ کے حکم میں داخل نہیں؟

تکافل میں یہی دوسری صورت بنتی ہے، کیونکہ اولاً چندہ دینے والا اپنے چندے کو وقف نہیں کر رہا، بلکہ جو حکماً ایک فرد ہے، اس کو اس نیت سے چندہ دیتا ہے کہ یہ شخصِ قانونی مستقبل میں زیادتی کے ساتھ چندہ واپس کرے گا۔

ثانیاً اگر چندہ دینے والا چندہ بطورِ وقف بھی دے تو زبان اور ترجمانانِ وقف حوض (شخصِ قانونی) اس وقف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، کیوں کہ پھر اس صورت میں بزعمِ خویش ''ہم خرما و ہم ثواب'' سے محرومی ہے۔

خود مجوزین حضرات لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ کہ تکافل ماڈل میں درج ذیل خصوصیات (Features) پائی جائیں اور درج ذیل مقاصد حاصل ہوں:

(۱) چندہ دہندگان کا چندہ کسی شرط سے مشروط نہ ہو'' ....

(تکافل کی شرعی حیثیت صفحہ:۸۹)

یعنی ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، رضا اور دوسروں کی معاونت کے قصد سے چندہ دے، جیسے مختلف اوقاف، مدارس اور رفاہی اداروں کو دیا جاتا ہے۔

الحاصل تکافل کے چندے کو وقف ہسپتال، مدارسِ دینیہ اور دیگر رفاہی اداروں کے چندے پر قیاس کر کے جائز کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ دونوں میں اساسی اور بنیادی دو واضح فرق ہیں :

(۱) ان رفاہی اداروں کو چندہ دینے والوں کی اپنے چندہ کو یا اس کو کچھ زائد ملا کر واپس لینے کی نیت نہیں ہوتی جبکہ تکافل میں ہر ایک کی زیادتی کی نیت مسلم ہے، الا ماشاءاللہ۔ کیونکہ جو مصیبت زدہ کی ہمدردی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے کوئی وجہ ترجیح نہیں کہ تکافل سے وابستہ متضررین سے ہمدردی زیادہ رکھے اور دوسروں سے کم۔

(۲) ان رفاہی اداروں کے بارے میں چندہ دینے والوں کو یقین کی حد تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ مساکین، غرباء اور مجبور اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت اور معاونت کے لیے بنائے گئے ہیں، اور ان کی اعانت اور خیر خواہی کی اکثر و اغلب صورتیں معاوضہ کے شائبہ سے بھی پاک ہوتی ہیں۔ اس لیے چندہ دینے والے دل کھول کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے چندہ دیتے ہیں، جبکہ تکافل میں چندہ دینے والے کو یقین کی حد تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رفاہی ادارہ نہیں، اس کا مقصد وقف کے جامع لفظ کے ذریعے سے منافع حاصل کرنا، اور اپنی ٹھاٹ باٹھ کی زندگی، غیر معمولی تنخواہوں اور دیگر غیر معمولی سہولیات کو ''تحفظ دینا ہے''، اس لیے تکافل کے مستحقین اغنیاء ہی ہوتے ہیں۔

بقول ایک مجوز صاحب کے:

''تمام وہ لوگ جنہوں نے قواعد (rules) کے مطابق فنڈ کی ممبر شپ حاصل کی ہے وہ فنڈ سے مستفید ہونے کے اہل ہیں''۔ (تکافل کی شرعی حیثیت، مولانا عصمت اللہ صاحب، ص:۱۱۰)

اور ظاہر ہے کہ یہ ممبر شپ صرف اغنیاء ہی حاصل کر سکتے ہیں لہٰذا فقیر کے لیے تکافل میں اولاً تو وقف ہوتا ہی نہیں اور ثانیاً اگر ہو بھی تو برائے نام اور قلیل تر، جبکہ فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے کہ وقف اصالۃً فقراء کے لیے ہے اور تبعاً اغنیاء کے لیے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى :(الوقف) على ثلاثة أوجه(اما للفقراء أو للاغنياء ثم الفقراء أو يستوى فيه الفريقان كرباط و خان و مقابر و سقايات وقناطر ونحو ذلک) كمساجد وطواحين وطست لاحتياج الكل لذلک بخلاف الادوية فلم يجز لغنى بلا تعميم أو تنصيص فيدخل الأغنياء تبعا للفقراء قنية.(الشامية ۴/ ۳۹۹،ط:ایچ ایم سعید)

تنبیہ : تکافل کے خلافِ شرع ہونے کی تفصیلی ۱۸ وجوہ استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی احمد ممتاز صاحب زید مجدہم کی کتاب ''مروجہ تکافل (اسلامی بیمہ وانشورنس) اور شرعی وقف !'' میں ہیں۔

﴿بعض غلط فہمیوں کا ازالہ﴾

﴿۱﴾ کسی نامور شخصیت کی رائے اور تحقیق کو محض اس کی شخصیت کی بناء پر مدلل رائے اور تحقیق پر ترجیح دینا :

آج کل عام ذہن یہ ہے کہ اگر کسی نامور اور مشہور شخصیت کی ایسی رائے اور تحقیق (جو بلا دلیل ہو یا مرجوح اور شاذ اقوال کی مرہونِ منت ہو) کے خلاف کوئی تحریراً یا تقریراً ایسی رائے اور تحقیق پیش کرے جو مدلل ہو اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو تو نہ تو اس مدلل رائے اور تحقیق کو سنا جائے اور نہ ہی اس کو قبول کیا جائے حالانکہ یہ ذہنیت خلافِ اصول ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخصیت کی شہرت کی وجہ سے مدلل بات کے رد کرنے کو ناجائز، جہلِ عظیم، احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری و بے باکی کہا ہے۔

کسی کی رائے اور تحقیق کے راجح اور معمول بہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رائے اور تحقیق قوی دلائل اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو، محض قائل کے عظیم المرتبہ ہونے یا اس کی شہرت اور علمی مقام سے اس کی رائے اور تحقیق کو ہرگز ہرگز راجح نہیں کہا جا سکتا۔

مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد، امتی کو رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور مقلّد کو مجتہد کے اجتہاد میں چوں و چرا کا نہ حق حاصل ہے اور نہ ہی جائز ہے لیکن غیر مجتہد عالم کی رائے اور تحقیق پر علماء کو کلام کا حق حاصل ہے اور جہاں کسی عالم کی رائے اور تحقیق کے خلاف دوسرے ہم عصر علماء نے کلام کیا ہو وہاں علماء کے لیے فریقین کے دلائل میں غور کیے بغیر آنکھیں بند کر کے شخصیت اور شہرت کی وجہ سے کسی کی رائے اور تحقیق کو راجح قرار دینا اور عمل کرنا جائز نہیں۔ ایسی صورت میں علمائے عصر پر لازم ہے کہ دلائل میں سنجیدگی اور انصاف سے، خالی الذہن ہو کر غور کریں اور جو رائے اور تحقیق دلائل اور اقوالِ راجحہ پر مبنی ہو، اسے قبول کریں اگرچہ وہ مدلل رائے اور تحقیق کسی غیر معروف اور چھوٹے درجے کے عالم کی طرف منسوب کیوں نہ ہو۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو ان جبال العلم والفقہ جو آپ کے ہم عصر بھی نہ تھے بلکہ صدیوں پہلے گزرے ہیں، کی اس رائے اور تحقیق پر بھی کلام کر کے اس کو رد کیا ہے جو دلیل پر مبنی نہ تھی اور حضرات علمائے کرام اور محققین رحمہم اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس کلام اور رد کو بنظرِ استحسان دیکھ کر قبول کیا ہے۔ کسی ایک معتبر عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس صنیع اور طرزِ عمل پر اعتراض کر کے کہا ہو کہ ان متقدمین کی شہرت اور مرتبہ کی وجہ سے ہم علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مدلل تحقیق کو رد کرتے ہیں، جبکہ آج یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم عصر، شہرت یافتہ عالمِ دین کی اس رائے اور تحقیق جو بلا دلیل ہو یا کمزور دلائل اور اقوالِ مرجوحہ پر مبنی ہو، کے خلاف بھی کسی عالمِ دین کو مدلل رائے اور تحقیق پیش کرنے کا حق نہ مانا جاتا ہے نہ اسے سنا جاتا ہے۔ علمائے کرام سے گزارش ہے کہ اس سوچ اور باطل نظریہ سے توبہ کر کے فریقین کے دلائل میں انصاف سے غور کر کے مدلل تحقیق کو قبول کیجیے اور ذیل میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ''شرح عقود رسم المفتی'' میں بیان کردہ باتوں کو بار بار پڑھیے، ان شاء اللہ تعالیٰ ذہن کی خوب صفائی

ہوجائے گی۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

(۱) علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :ایک مرتبہ وقف سے متعلق میں نے ایک فتویٰ دیا جو مذہب کی عام کتابوں کے موافق تھا، اس مسئلہ میں عمدۃ المتأخرین ''علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ'' (صاحب الدر المختار) پر معاملہ مشتبہ ہوگیا ہے، انہوں نے ''درمختار'' میں اس مسئلہ کو خلافِ صواب ذکر فرمایا ہے، میرا وہ فتویٰ ملک کے بعض مفتیان کے ہاتھ لگ گیا، انہوں نے اس کی پشت پر میرے فتویٰ کے خلاف اور ''درمختار'' کے مطابق فتویٰ لکھا اور بعض نے تو یہ بھی لکھا کہ ''علائی'' اور ''درمختار'' میں جس طرح مسئلہ ہے وہی ''معمول بہا'' ہے کیوں کہ وہ متاخرین میں عمدہ اور معتمد علیہ ہیں، نیز یہ بھی لکھا کہ ''اگر تمہارے پاس اس کے خلاف دلیل بھی ہے تو بھی ہم اس کو قبول نہیں کریں گے''۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: دیکھا آپ نے یہ جہلِ عظیم، احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری وبے باکی اور کتابوں کی طرف مراجعت کیے بغیر اور علم کے بغیر فتویٰ نویسی پر اقدام! کاش ان صاحبوں نے علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ''درمختار'' کا حاشیہ ہی دیکھ لیا ہوتا کیوں کہ وہ ان کو بآسانی دستیاب ہوسکتا تھا حلبی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر تنبیہ کی ہے کہ علائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا ہے وہ مسئلہ کی صحیح تعبیر نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وقد كنت مرة افتيت بمسألة فى الوقف موافقا لـما هو المسطور فى عامة الكتب وقد اشتبه فيها الامر على الشيخ علاء الدين الحصكفى عمدة الـمتاخرين فذكر فى الدر المختار على خلاف الصواب فوقع جوابى الذى افتيت به بيد جماعة مـن مـفتـى البـلاد ، كتبـوا فـى ظهره بخلاف ما افتيت به موافقين لما وقع فى الدر المختار وزاد بـعض هؤلاء المفتين ان هذا الذى فى العلائى هو الذى عليه العمل لانه عمدة المتاخرين وانه ان كـان عـنـدكـم خـلافـه لانـقبل منكم فانظر الى هذا الجهل العظيم والتهور فى الاحكام الشرعية والاقـدام عـلـى الفتيا بدون علم و بدون مراجعة . وليت هذا القائل راجع حاشية العلامة الشيخ ابـراهيـم الـحـلبـى عـلى الدر المختار فانه اقرب مايكون اليه فقد نبه فيها على انه ماوقع للعلائى خطأ فى التعبير . (شرح عقود رسم المفتى ،ص : ۱۷ ،ط: البشرىٰ)

دیکھیے! علامہ علاء الدین حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ کو خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ عمدۃ المتاخرین فرماتے ہیں پھر بھی ان کی غیر مدلل اور خلافِ صواب رائے پر جمود، اور صحیح اور مدلل بات کے انکار کو جہلِ عظیم اور احکامِ شرعیہ کو ٹھکرانے میں تہوّر اور دیدہ دلیری وبے باکی فرمار ہے ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالی کی وفات ۱۰۸۸ھ میں ہوئی یعنی علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ گیارہویں صدی کے فقیہ ہیں، جبکہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ولادت ۱۱۹۸ھ میں اور وفات ۱۲۵۲ھ میں ہوئی گویا آپ تیرہویں صدی کے فقیہ ہیں اور دونوں میں ۱۶۴ سال (تقریباً دوصدی) کا فاصلہ ہے یعنی علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ جو عمدۃ المتأخرین ہیں، ۱۶۴ سال پہلے گزرے ہیں، پھر بھی علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے آپ رحمہ اللہ تعالیٰ کی غیر

مدلل اور خلافِ صواب تحقیق کو قبول نہیں کیا۔

کیا آج کی کوئی نامور شخصیت، اور فقیہ علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ (جو عمدۃ المتأخرین مانے گئے ہیں) سے بھی اونچے درجے کے ہیں کہ ان کی تحقیق اور رائے پر کلام کرنا ناجائز، گستاخی اور ناقابلِ سماعت سمجھا جائے؟

(۲) علامہ ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ جو کہ علمائے احناف رحمہم اللہ تعالیٰ میں بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے، انہوں نے شراحِ ہدایہ پر رد کرتے ہوئے یہ تحقیق پیش کی کہ ''ظاہر الروایہ'' اور ''روایۃ الاصول'' میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ظاہر الروایہ عام مطلق ہے اور روایۃ الاصول خاص مطلق ہے۔ یعنی ہر روایۃ الاصول، ظاہر الروایہ ہے لیکن ہر ظاہر الروایہ، روایۃ الاصول نہیں۔ کیونکہ ''روایۃ الاصول'' کتبِ ستہ کے ساتھ خاص ہے'' اور ظاہر الروایہ'' نوادر کی روایات کو بھی کہتے ہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''شرح عقود رسم المفتی'' میں ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ کی دلیل کا ضعف بتا کر ان کی تحقیق کو رد کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شرح عقود رسم المفتی، ص:۲۲)

تنبیہ : علامہ ابنِ کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات ۹۴۰ھ میں ہوئی اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی ولادت ۱۱۹۸ھ میں ہوئی، یعنی دونوں میں ڈھائی صدی سے زیادہ فرق ہے، پھر بھی علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علمی مقام و مرتبے اور قدامت کی پروا کیے بغیر ان کی تحقیق کو دلائل کی روشنی میں پرکھ کر رد فرمایا ہے اور کسی نے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ کیا ظلم کر دیا کہ اتنے بڑے مشہور فقیہ اور متقدم کی تحقیق کو رد کیا جا رہا ہے جبکہ آج معاصر کی تحقیق کے رد پر شور مچ جاتا ہے۔

سوچیے تو سہی! ہم علمی میدان اور اس کے آداب اور تحقیقات پر غور کے طور طریقوں سے کتنے نابلد ہیں؟

کیا عصر حاضر کے نامور علمائے کرام کا مقام اور فقہ میں درجہ علامہ ابن کمال پاشا رحمہ اللہ تعالیٰ جو حنفی فقیہ اور محدثِ کبیر ہیں، سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ کہ ان کی رائے کے خلاف کچھ بھی سننے سے انکار کیا جائے؟ اور براہینِ قاطعہ بدیہیہ دیکھنے اور ان پر غور کرنے کے لیے کسی بھی صورت میں آمادہ نہ ہوں؟

الحاصل! واضح رہے کہ قرآن وحدیث یا کسی مجتہد کی بات کو تو بلا دلیل اور بغیر حکمت جانے قبول کیا جائے گا لیکن ان کے علاوہ بڑے سے بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو، ان کی بات کو بلا دلیل تسلیم نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جبکہ وہ بات بدیہی طور پر دلائلِ شرعیہ کے خلاف ہو یا ضعیف اور مرجوح اقوال پر مبنی ہو۔

﴿۲﴾ کسی شخصیت کے قول کی تضعیف سے اس کے قائل اور شخصیت کی تضعیف ہرگز لازم نہیں آتی، چنانچہ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے اختلافی اقوال اس پر واضح دلیل ہیں۔ احناف رحمہم اللہ تعالیٰ، شوافع، حنابلہ اور مالکیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال کی تضعیف بھی ثابت کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان حضرات کی عظمت واحترام میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی اور نہ کوئی اس سے ان حضرات کو ضعیف سمجھتا ہے۔

مفتی اعظم حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

عظمت کا قائل ہونا الگ چیز ہے اور رائے مختلف ہونا اور چیز ہے، قول کی تضعیف سے قائل کی تضعیف نہیں ہوتی، ہم حدیث کی مباحث میں بہت سے اقوال کی تضعیف کرتے ہیں مگر ان کے قائلین کی عظمت ہمارے قلوب سے محو نہیں ہوسکتی، اسی طرح ایک وقت امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو ''منتخل الحدیث'' کہتے ہیں تو دوسرے وقت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کی پیشانی پر بوسہ دے کر عرض کرتے ہیں: **دعنی اقبّل رجلیک یا استاذ الاستاذین ویا سید المحدثین ویاطبیب الحدیث فی علله** ۔(ارشادالقاری الی صحیح البخاری، ص:۳۶)

چونکہ عوام اور سطحی ذہن کے علماء اس اصل سے واقف نہیں اس لیے جس شخصیت کی رائے کی مخالفت کی جاتی ہے وہ خود بھی اور اس کے حواری اور حمایتی بھی عوام الناس کے ذہنوں میں مخالفین کی نفرت ڈالنے کے لیے یہ کہتے رہتے ہیں کہ فلاں اکابر کے خلاف ہے، فلاں کے دل میں اکابر کی عظمت نہیں، فلاں اکابر کے خلاف لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ اگر یہ لوگ ایسا دیدہ ودانستہ کرتے ہیں تو درخواست ہے کہ اس روش سے توبہ کرنی چاہیے اور اگر غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو اس تحریر اور حقائق سے غلط فہمی کو دور کرنا چاہیے۔

﴿۳﴾ راجح قول پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا واجب ہے اور راجح کو چھوڑ کر مرجوح پر عمل کرنا اور فتویٰ دینا اتباعِ ھویٰ اور حرام ہے اتفاقاً و اجماعاً۔

حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

(۱) **واعلم بان الواجب اتباع ما ترجیحه عن اهله قد علما.**

(شرح عقود رسم المفتی ص: ۷)

اس شعر میں ''الواجب'' کا لفظ بتا رہا ہے کہ راجح قول پر عمل اور فتویٰ واجب ہے اور ظاہر ہے کہ جب راجح پر واجب ہے تو اس کے خلاف مرجوح پر حرام ہوگا۔

(۲) **وقد نقلوا الاجماع علی ذلک فی الفتاوی الکبری للمحقق ابن حجر المکی : قال فی زوائد الروضة انه لایجوز للمفتی والعامل ان یفتی او یعمل بما شاء من القولین او الوجهین من غیر نظر وهذا لاخلاف فیه وسبقه الی حکایة الاجماع فیهما ابن الصلاح والباجی من المالکیة فی المفتی وکلام القرافی دال علی ان المجتهد والمقلد لایحل لهما الحکم والافتاء بغیر الراجح لانه اتباع للهوی وهو حرام اجماعا .(شرح عقود رسم المفتی، ص:۸)**

دیکھیے! اس عبارت میں ترجیح میں غور کیے بغیر فتویٰ اور عمل کو اتفاقاً ناجائز کہا ہے اور مرجوح پر فتویٰ دینے کو اتباعِ ہویٰ اور نفس پرستی کہہ کر بالاجماع حرام قرار دیا ہے۔

(۳) علامہ قاسم ابن قطلو بغا رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

سمعت من لفظ بعض القضاة : هل ثم حجر؟ فقلت: نعم ! اتباع الهوی حرام والمرجوح فی مقابلة الراجح بمنزلة العدم والترجیح بغیر مرجح فی المتقابلات ممنوع.(شرح عقود ص:۸)

دیکھیے! محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگردِ رشید علامہ قاسم بن قطلو بغا رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو اتباعِ

ہوئی قرار دے کر حرام فرمایا ہے۔

(۴) وقال فی کتاب الاصول للیعمری : من لم یطلع علی المشهور من الروایتین او القولین فلیس له التشهی والحکم بماشاء منهما من غیر نظر فی الترجیح.(شرح عقود ص:۸)

روایتِ مشہورہ، راجحہ پر عدمِ اطلاع کی صورت میں ترجیح میں غور کیے بغیر عمل اور فتویٰ کو "تشہی" (خواہشاتِ نفس پر چلنا) کہا گیا ہے تو جب راجح اور مرجوح دونوں معلوم ہوں لیکن راجح سے مجوزہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس لیے اس کو چھوڑ کر مرجوح کو معمول بہ بنایا جائے تو اس صورت کا کیا حکم ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا ہے کہ "تم اس زمانے میں ہو کہ خواہشات علم کے تابع ہیں، عنقریب تم پر ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں علم خواہشات کے تابع ہوگا"۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ افسوس سے فرمایا کرتے تھے کہ "لوگوں نے علم (یقینی دلائل اور واضح باتوں) کو چھوڑا اور غرائب (ناآشنا باتوں اور مجہول و کمزور دلائل) میں پڑ گئے۔ ہائے! ان میں علم کتنا کم ہے"؟

حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتنی عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ "(ایک زمانہ ایسا تھا کہ) لوگ حلال وحرام سے خوب واقف تھے، وہ مستحبات اور مکروہات معلوم کر کے اہتمام کرنے والے تھے یعنی ان کے سامنے حلال وحرام خوب ظاہر تھا، حرام سے بچنے کے ساتھ ساتھ مکروہات سے بھی بچتے تھے اور حلال کے اہتمام کے ساتھ ساتھ مستحبات کا خیال بھی رکھتے تھے جبکہ تم صرف یہی پوچھتے ہو کہ حلال ہے یا حرام؟" گویا مستحب اور مکروہ کا اہتمام ہی نہیں۔

الحاصل! وہ لوگ اس معاملے میں تم سے بہت آگے تھے۔

وقال الامام الغزالی رحمه الله تعالیٰ : ولقد صدق ابن مسعود رضی اللہ عنہ حیث قال انتم الیوم فی زمان الهوی فیه تابع للعلم وسیأتی علیکم زمان یکون العلم فیه تابعا للهوی وقد کان أحمد بن حنبل یقول ترکوا العلم وأقبلوا علی الغرائب ما أقل العلمَ فیهم والله المستعان وقال مالک بن أنس رحمه الله تعالیٰ لم تکن الناس فیما مضی یسألون عن هذه الأمور کما یسأل الناس الیوم ولم یکن العلماء یقولون حرام ولا حلال ولکن أدرکتهم یقولون مستحب ومکروه ومعناه أنهم کانوا ینظرون فی دقائق الکراهة والاستحباب فأما الحرام فکان فحشه ظاهرا.

(احیاء العلوم ۱/۱۱۷، ط:قدیمی)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: کہ تم لوگ ایسے زمانے میں ہو کہ اس وقت خواہشات علم کے تابع ہیں لیکن عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ علم خواہشات کے تابع ہوگا یعنی جن چیزوں کو اپنا دل چاہے گا وہی علوم سے ثابت کی جائیں گی"۔ (فضائل صدقات، ص:۴۹۵)

تنبیہ : یاد رکھیے کہ شخصی اور نجی ضرورت اس سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا مضطر (مجبور) اور ضرورت مند شخص کے لیے بوقتِ اضطرار (مجبوری) اور ضرورت، ضعیف اور مرجوح قول پر عمل کی گنجائش ہے، اسی طرح مفتی کے لیے بھی گنجائش

ہے کہ ایسے شخص کو ضعیف اور مرجوح قول پر فتوی دے کر عمل کی گنجائش دے، چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولا یجوز بالضعیف العمل　　ولا به یجاب من جاء یسئل
الا لعامل له ضرورة　　او من له معرفة مشهورة

وقد ذكر صاحب البحر فى الحيض فى بحث الوان الدماء اقوالا ضعيفة ثم قال: وفى المعراج عن فخر الائمة: لو افتى مفت بشىء من هذه الاقوال فى مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا وبه علم ان المضطر له العلم بذلك لنفسه كما قلنا وان المفتى له الافتاء به للمضطر فما مر من انه ليس له العمل بالضعيف والافتاء به ، محمول على غير موضع الضرورة كما علمته من مجموع ما قررناه والله تعالى اعلم. (شرح عقود رسم المفتی، ص: ۸۴،۸۷،ط:البشری)

﴿۴﴾ جدید مسائل کو سمجھنے کے لیے عصری علوم میں مہارت ضروری نہیں:

آج کل طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ لوگ بلکہ علماء تک مسائلِ شرعیہ کے احکام کو سمجھنے اور بتانے کے لیے عصری فنون خصوصاً انگریزی دانی، مغربی معاشیات اور بینکنگ میں مہارت کو ضروری سمجھنے لگے ہیں جبکہ جدید معاملات کے مسائل کو سمجھنے کے لیے انگریزی دان، ماہرِ معاشیات یا ماہرِ بینکنگ ہونا ہرگز ضروری نہیں بلکہ محض فقہی مسائل سے واقفیت بھی کافی ہے۔ قرونِ مشہود لہا بالخیر سے لے کر ماضی قریب تک کے تمام علماء اس حقیقت پر متفق چلے آرہے ہیں، خود مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہم نے بھی اپنی کتاب غیر سودی بینکاری میں اسی حقیقت کو لکھا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں :

> ''واقعہ یہ ہے کہ فقہی مسائل چاہے معاشی یا مالی معاملات سے متعلق ہوں ان کا شرعی حکم جاننے یا بتانے کے لیے ایک مفتی کا نہ ماہرِ معاشیات ہونا ضروری ہے، نہ بینکنگ کا ماہر ہونا اور نہ انگریزی زبان سے واقف ہونا، البتہ ایک بات جس طرح دوسرے مسائل میں ضروری ہے ان مسائل میں بھی ناگزیر ہے اور وہ یہ کہ جس بات پر وہ کوئی حکم لگا رہا ہے اس کی صحیح صورتِ مسئلہ اسے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہو کیونکہ فتوی کا حکم اسی صورت پر لگتا ہے اور ''الحکم علی الشی ء فرع عن تصورہ''، اگر کسی مفتی کے سامنے غلط صورتِ واقعہ بیان کی جائے تو یقیناً اس کا فتوی اسی غلط صورت کے مطابق ہوگا جو نفس الامر کے مطابق نہیں ہوگا''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۵۵)

کاش متأثرینِ جدیدیت بھی اس اتفاقی حقیقت کو مان کر اپنے نظریات و خیالات کو اسلاف کے متفقہ نظریات کے مطابق بنا لیتے !!!!!

﴿۵﴾ خلاف اور اختلاف میں فرق: اگر کسی مسئلہ میں مختلف اقوال دلائل پر مبنی ہوں تو اس صورت میں علمی میدان میں کہا جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں ''اختلاف'' ہے جو کہ جائز اور محمود ہے اور اگر دلائل پر مبنی نہیں تو اس کو ''خلاف'' کہا جاتا ہے، جو کہ مذموم اور برا ہے۔ دوسری صورت کے اختیار کرنے والے کو کہا جائے گا کہ اس نے اس

مسئلہ کی اتفاقی حقیقت کے خلاف کیا ہے، یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں فلاں کا اختلاف ہے یا یہ اختلافی مسئلہ ہے، صحیح نہیں ۔

اسی طرح راجح کے مقابلہ میں مرجوح قول بھی ''خلاف'' ہوتا ہے لہٰذا جو مرجوح قول کے مطابق فتویٰ اور حکم بتا تا ہے اس کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ اس نے اتفاقی حقیقت کے خلاف کیا ہے، اس صورت میں بھی یہ کہنا کہ اس مسئلہ میں فلاں کا ''اختلاف'' ہے یا یہ اختلافی مسئلہ ہے، صحیح نہیں ۔

''کشاف اصطلاحات الفنون'' میں اختلاف اور خلاف کے اس فرق کو بایں الفاظ واضح کیا گیا ہے:

الاختلاف لغة ضد الاتفاق قال بعض العلماء ان الاختلاف يستعمل فی قول بنی علی الدليل والخلاف فيما لا دليل عليه كما فی بعض حواشی الارشاد ويؤيده مافی غاية التحقيق منه ان القول المرجوح فی مقابلة الراجح يقال له خلاف لا اختلاف. ... والحاصل منه ثبوت الضعف فی جانب المخالف فی الخلاف فانه كمخالفة الاجماع و عدم ضعف جانب فی الخلاف لانه ليس فيه خلاف ما تقرر ،انتهى.

(كشاف اصطلاحات الفنون ۲/۵۷،ط:دار الكتب العلميه،بيروت)

وقال العلامة المرغينانی رحمه الله تعالی : وفی ما اجتمع عليه الجمهور لايعتبر مخالفة البعض وذلك خلاف وليس باختلاف والمعتبر الاختلاف فی الصدر الاول.

(الهداية ،كتاب آداب القاضی،فصل فی قضاء المرأة ۳/۱۴۲ ، ط:شركة علميه)

﴿۶﴾ خلاف کے نقصانات میں سے دواہم نقصان یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ دلیل اور راجح قول پر مبنی بات شریعت ہے اور اس کے خلاف کرنا خلافِ شرع ہے اور خلافِ شرع بات سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ۔ہم چونکہ انسان ہیں لہٰذا انسان ہونے کی بنا پر غلط فہمی ہوجاتی ہے لیکن غلط فہمی والا گنہگار نہیں ہوتا، البتہ حقیقت یہی ہے کہ اگر کوئی دیدہ و دانستہ دلیل پر مبنی بات کو چھوڑے گا اور اس کے خلاف کرے گا تو وہ گنہگار ہوگا۔

الحاصل! دلیل پر مبنی بات شریعت ہے اور بغیر دلیل کے اس کے خلاف کرنا اور اس کا انکار کرنا خلافِ شرع ہے اور خلافِ شرع امر سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ۔

(۲) ایک ناجائز کی خاطر کئی ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے ۔ یعنی جب آپ نے دلیل اور راجح قول پر مبنی بات کو چھوڑا اور اس کے خلاف قول کیا اب اس کو درست کرنے کے لیے کئی ناجائز کرنے پڑیں گے ۔